R-N-2/86/56 REGD NO. L922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ اشاعت
۱ - ۸ - ۱۵،۲۲

جلد ۲۷، شمارہ ۳۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ ستمبر ۱۹۶۸ء

آل احمد سرور

ایک روشن چراغ تھا نہ رہا

نجیب اشرف ندوی ایک عرصے سے بیمار تھے۔ اپنی بیوی کے انتقال کے بعد وہ بجھ سے گئے تھے، پھر بھی اپنے علمی کاموں میں لگے رہتے تھے اور صحت کی خرابی کے باوجود اپنی وضع پر قائم تھے۔ بالآخر ستمبر کو وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور اپنے دوستوں، مداحوں اور عقیدت مندوں کے ایک بڑے حلقے کو سوگوار چھوڑ گئے۔

میری ملاقات ان سے سب سے پہلے ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں میرے والد مانڈوی (بمبئی) میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ بمبئی دیکھنے کا شوق بچپن سے تھا، چنانچہ یونی ورسٹی کی تعطیل میں بمبئی گیا۔ قدرتاً اسماعیل کالج اندھیری بھی پہنچا۔ وہاں فضل الرحمن صاحب پرنسپل اور نجیب اشرف صاحب ندوی سے ملاقات ہوئی۔ شام کا وقت تھا کالج میں کوئی کلچرل پروگرام ہو رہا تھا۔ یہ لوگ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں طلبہ نے گجرات کا مشہور رقص گربا پیش کیا۔ نجیب اشرف صاحب نے خاصے فخر کے لہجے میں بتایا کہ یہاں طلبہ اور طالبات مل کر ایسے پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں۔ مسلمان بھی اور ہندو بھی۔ مجھے اسی وقت اندازہ ہوا کہ نجیب اشرف صاحب قدیم رنگ کے دلدادہ ہونے کے باوجود سنجیدہ تہذیبی پروگراموں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شرکت کو برا نہیں سمجھتے۔ انھوں نے علی گڑھ کے ہر جاننے والے کا الگ الگ حال پوچھا، سب کے کارناموں پر تبصرہ کیا۔ بہار کے ایک ہونہار طالب علم معین الدین دردائی کے متعلق کہا کہ نہایت محنتی اور مخلص نوجوان ہیں مگر ان میں بہاریت ہے۔ غالباً ان کا مطلب یہ تھا کہ مقامی رنگ ان پر زیادہ ہے۔ ویسے وہ خود بہار سے تعلق رکھتے تھے اور سید سلیمان ندوی کے عزیز اور ہم وطن تھے۔ اس گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ علاقائی تعصب سے آزاد ہیں۔ غرض اس باغ و بہار شخصیت نے میرے ذہن پر بہت دلکش نقش چھوڑا۔

پھر تو نجیب اشرف صاحب سے خط و کتابت بھی رہی، علمی کانفرنسوں اور یونی ورسٹیوں کی کمیٹیوں میں اکثر ملاقات بھی ہوتی رہی اور ان سے خاصا ربط ضبط بڑھا۔ جب کبھی بمبئی جانا ہوا تو ان سے ملاقات ضرور ہوئی، آخری بار چونکہ صرف ایک دن کے لیے گیا تھا اس لیے نہ مل سکا۔ ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ میں اورینٹل کانفرنس تھی۔ اردو کے شعبہ کے صدر پنڈت کیفی تھے۔ سکریٹری میں تھا۔ میری دعوت پر اور لوگوں کے علاوہ ندوی صاحب بھی تشریف لائے۔ ایسے موقعوں پر مقالہ نگار، عام طور پر وقت کی کمی کے باوجود اپنا مقالہ پورا پڑھنا چاہتے ہیں اور ذرا بھی اختصار کی ضرورت کا اظہار کیا جائے تو خفا ہو جاتے ہیں۔ ندوی صاحب نے خود ہی صورت حال کا اندازہ کر لیا، مقالہ میرے حوالے کیا اور دس منٹ میں اس کا خلاصہ بیان کر کے اپنی نشست پر آ بیٹھے۔

بمبئی یونی ورسٹی میں اردو کا علم انھوں نے عرصہ دراز تک بلند رکھا۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ جمع کیا، پھر عبدالرزاق قریشی جیسے نوجوان تیار کیے جنھوں نے تحقیق و تدوین میں قابل قدر کام کیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے رسالے نوائے ادب نے تحقیق کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا اور رسائل کے اشاریے شائع کرنے کی طرح ڈالی۔ نجیب اشرف صاحب کام ادھورے پن کے قائل نہ تھے۔ جو کام کرتے تھے اس میں پوری تلاش اور تحقیق سے کام لیتے تھے۔ اشتہاریت، اپنی تعریف، دوسروں پر اعتراض اور طنز سے وہ ہمیشہ کوسوں دور رہے۔

نجیب اشرف صاحب نے کوئی ادبی گروہ نہیں بنایا۔ انھوں نے کوئی سیاست نہیں چلائی۔ انھوں نے دوسروں کے کاموں میں کیڑے ڈال کر شہرت حاصل کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ وہ جہاں

کوئی اچھا علمی تحقیقی یا تنقیدی کارنامہ دیکھتے تھے، کھلے دل سے اس کی تعریف کرتے تھے۔ وہ تنقید بھی کرتے تھے تو تعمیری اور کسی خامی کی طرف بھی اشارہ کرتے تھے تو اس طرح کہ اس کو دور کرنے کا جذبہ خود بخود پیدا ہوتا۔ لکھنے والوں اور طالب علموں کے ساتھ انھیں گہری ہمدردی تھی۔ علم، ادب، تہذیب، انسانیت کی قدروں کو انھوں نے ہمیشہ عزیز رکھا۔

دہلی میں ایک اردو کانفرنس کے موقع پر جامعہ میں مندوبین کی چائے پر دعوت تھی۔ چائے کے بعد میں نے دیکھا کہ نجیب اشرف صاحب ایک ایک سے آٹوگراف لے رہے ہیں اور اصرار کر رہے ہیں کہ کچھ لکھئے بھی۔ میرے پاس بھی تشریف لائے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت آپ کو یہ کیا سوجھی۔ کہنے لگے ادیبوں کی تحریریں جمع کرنے کا مجھے شوق ہے آپ دیکھئے گا بعد میں یہ تحریریں کتنی مفید ثابت ہوں گی۔

نجیب اشرف صاحب کی یاد تازہ رکھنے کے لئے بمبئی والوں کو خصوصاً اور اردو دوستوں کو عموماً اردو میں ریسرچ کے لئے کوئی فیلوشپ اور توسیعی لیکچروں کا کوئی سلسلہ قائم کرنا چاہئے۔ ان کے غیر مطبوعہ مضامین کو شایع کرنے کے لئے بھی اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو مناسب اقدامات کرنے چاہئیں۔

پریم ناتھ دت

روداد!

اے رات! قیدی کو اپنا گیت الاپ لینے دے
پو پھٹنے سے پہلے اس کے بازو ڈھیلے پڑ جائیں گے
اور اس کی دار پر کھنچی ہوئی لوتھ
ہوا کے جھونکے کے ساتھ جھولنا جھول رہی ہوگی

اے رات! ذرا آہستہ چل!
مجھے دل کی بات کہہ لینے دے
میں کون ہوں؟ شاید تو مجھے
اور میری دکھ بھری کہانی کو بھول چکی ہے

اے دلسوزی! زندگی کے کتنے لمحے
حیف تو نے! چاپلوسوں میں یونہی گذار دئے
میرے رونے میں "خوف" کو کوئی دخل نہیں
یہ آنسو میں نے اپنے وطن کے لئے بہائے ہیں

ان بے آسرا بچوں کے لئے ہیں
جو گھر میں بلک رہے ہیں
بے باپ کے! فاقوں کے مارے
میرے بعد ان کی کون خبر گیری کرے گا

میرے دو بھائی تھے، ماں جائے!
وہ مجھ سے پہلے دار پر چڑھ چکے ہیں
وطن کی ناموس کے لئے
ان سے جو بن آیا وہ کر گزرے
آہ میری بیوی کس طرح دن کاٹے گی
تنہا! لاوارث! گریاں نالاں
جب وطن کو اسلحہ کی ضرورت پڑی
تو میں اس کے طلائی کنگن بھی اتار لایا تھا

عثمانیہ یونی ورسٹی کی گولڈن جوبلی

حیدرآباد۔ حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونی ورسٹی جس میں سب سے پہلے ایک ملکی زبان اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا کامیاب تجربہ کیا گیا تھا۔ اس کی گولڈن جوبلی اکتوبر میں منائی جا رہی ہے۔ اس موقع پر حیدرآباد کے جنرل پوسٹ آفس اور جامعہ عثمانیہ کے پوسٹ آفس میں ایک خصوصی کی ڈاک کی مہر لگائی جائے گی "عثمانیہ یونی ورسٹی ۱۹۱۸-۱۹۶۸ء گولڈن جوبلی" مہر کی یہ عبارت صرف دو زبانوں ہندی اور انگریزی میں ہوگی۔ غریب اردو کو اس میں کوئی جگہ نہ ہوگی۔

(سیاست)

ڈاکٹر رادھا کرشنن کو ساہتیہ اکیڈمی کا پہلا فیلوشپ

مدراس۔ صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے سابق صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن کو موصوف کی رہائش گاہ پر منعقد ایک خصوصی تقریب کے دوران میں ساہتیہ اکیڈیمی کا پہلا فیلوشپ پیش کیا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کا انتخاب اکیڈیمی مذکور کی طرف سے پہلے فیلو کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اس موقع پر موصوف کو ایک تمر پتر پیش کیا گیا جو فیلوشپ کی علامت ہے۔ (الجمعیۃ)

روہیل کھنڈ اخبار بند

بریلی۔ یہاں سے نکلنے والا اردو ہفتہ وار "روہیل کھنڈ اخبار" ۴۸ برس کے بعد اردو میں اپنی اشاعت بند کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اس کے بانی اور ایڈیٹر بیج بہادر سنہا نے اعلان کیا ہے کہ اردو جاننے والوں کی تعداد گھٹ رہی ہے اس لئے اخبار کی اشاعت بھی برابر متاثر ہو رہی تھی اب اس کو انگریزی میں شایع کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ (قومی آواز)

سید شہاب الدین دسنوی

پروفیسر نجیب اشرف ندوی (مرحوم)

سن سفید بال، مرنجان و مرنج، خوش مزاج اور خوش اخلاق، عام طور سے بمبئی شہر میں "پروفیسر ندوی" اور سارے ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں "نجیب اشرف ندوی" کے نام کی شخصیت ۵ر ستمبر ۱۹۶۸ء کو تقریباً ۱۲ بجے دن کو اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔

نجیب اشرف ندوی دسنہ (ضلع پٹنہ) کے باشندے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی ایما پر ندوۃ العلماء (لکھنؤ) بھیج دئے گئے۔ ہوا یہ کہ مولانا سید سلیمان ندوی اپنے بھتیجے سید ابو ظفر (ندوی) کی شادی کی تقریب میں شریک ہونے کے لئے دسنہ آئے ہوئے تھے۔ اسی سلسلے میں نجیب اشرف اور ان کے والد ڈاکٹر سید حسین بھی وہاں پہنچے تھے۔ سید صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے (جو ان کے چچا تھے) فرمایا "نجیب اشرف کا کوئی بڑا بھائی نہیں ہے اور میرا کوئی چھوٹا بھائی نہیں، انھیں آپ میرے ساتھ کر دیجئے۔" ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل ان کی بات مان لی۔ چنانچہ آٹھ سال کی عمر میں نجیب اشرف صاحب ندوہ میں داخل کر دئے گئے۔ اور ۱۹۱۳ء تک وہیں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مولانا شبلی کے ندوہ سے منتعفی ہونے پر طلبہ کی اسٹرائک کے ساتھ نجیب اشرف نے بھی ندوہ چھوڑا اور انگریزی پڑھنے پٹنہ چلے گئے۔ میٹرک اور انٹر کے امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اسکالرشپ ملی۔ بی۔ اے کے آخری سال میں تھے کہ ملک میں سیاسی شورش برپا ہوئی۔ نجیب اشرف بھی تعلیم ترک کر کے دل و جان سے تحریک میں شریک ہوئے۔ اس وقت ان کے ہیرو جواہر لال اور سید سلیمان ندوی تھے۔ پہلے تو ان کے والد ماجد نے تحریک سے باز رکھنے کی کوشش کی پھر اس زمانے کے صوفیوں کے زیر اثر انھوں نے اپنی مخالفت واپس لی۔ تحریک ختم ہو گئی تو دوبارہ تعلیم کی تکمیل کا خیال آیا۔ پٹنہ کالج کے پرنسپل نے واپس لینے کی شرط میں معافی نامہ طلب کیا جس پر وہ تیار نہ ہوئے۔ نجیب اشرف کے چھوٹے بھائی علی اشرف کلکتہ میں زیر تعلیم تھے ان کے بلانے پر کلکتہ چلے گئے اور بی۔ اے فائنل میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں فارسی نے کر فرسٹ کلاس فرسٹ آئے پھر ۱۹۲۶ء میں ایم۔ اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ اور یونیورسٹی کا سونے کا تمغہ حاصل کیا۔

کلکتہ میں اپنی تعلیم کے دوران ہی وہ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) سے بھی وابستہ رہے تھے۔ جب تعلیم پوری کر لی تو رقعات عالمگیر کی ترتیب کے سلسلے میں مشہور مورخ سر جادو ناتھ سرکار کے ساتھ دو سال تک کام کرتے رہے۔ انہی دنوں کلکتہ میں پروفیسر محفوظ الحق، چراغ حسن حسرت (لاہور)، عبدالرزاق ملیح آبادی وغیرہ سے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں وہ دارالمصنفین کے رفیق کی حیثیت سے صرف سو روپے ماہانہ پر کام کرنے لگے۔ ۱۹۳۰ء میں گجرات کالج (احمد آباد) میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ وہیں گجراتی اور گجراتی زبان سے تعلق پیدا ہوا اور گجرات میں اردو کی پہلی اول صورت پر تحقیق کی۔ ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ اسماعیل یوسف کالج کا بمبئی میں اجرا ہوا اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے یہاں آگئے اور ۲۴ سال کی خدمت کے بعد ۱۹۵۵ء میں پنشن پائی۔ اس کے بعد وہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے مستقل ڈائرکٹر اور اس کے سہ ماہی رسالہ "نوائے ادب" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے یہاں تک کہ موت نے یہ رشتہ منقطع کر دیا۔

نجیب اشرف ندوی کا پہلا مضمون "زمانہ" کانپور میں چھپا۔ اس کے بعد معارف، ہمایوں، اردو، الناظر، جامعہ، نیرنگ خیال، زمیندار (لاہور)، انقلاب (لاہور)، ہمدرد (دلی) میں ان کے بے شمار مضامین اور مقالے شائع ہوئے۔

کتابوں میں رقعات عالمگیر، لغات گجری، مہاتما گاندھی کی تصنیف "سوراج" کا ترجمہ "رہنمائے حکومت" شائع ہوئیں۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی ایک شفیق استاد تھے، اپنے شاگردوں سے وہ اس طرح تعلق رکھتے تھے کہ وہ انھیں کبھی نہیں بھولتے تھے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تو بڑے احترام سے پیش آتے۔ ایک محقق کی حیثیت سے وہ بے حد محتاط تھے۔ تحقیقی کاموں میں وہ ہمیشہ گہرائی دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک بار انھیں معارف کے لئے ایک مشہور تحقیقی کتاب پر ریویو لکھنا تھا۔ خود ان کا بیان ہے کہ اس کام کے لئے انھوں نے پہلے ڈیڑھ سو کتابوں کا مطالعہ کیا تب جا کر وہ تبصرہ لکھا۔ ان کے مقالوں اور تصنیفات میں بھی ہر لفظ اور ہر فقرہ جچا تلا اور تحقیق کی کسوٹی پر کسا ہوا تھا۔ تحقیق کے ساتھ ان کی تحریر میں زور تھا۔

نجیب اشرف ندوی نہ صرف عالم اور محقق تھے بلکہ اردو کی تحریک سے بڑی گہری اور عملی دلچسپی رکھتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں مولوی عبدالحق بمبئی آئے تو انجمن کی ریاستی شاخ کی تنظیم کا کام ان کے سپرد کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے دور دور تک شاخیں قائم کیں۔ پی۔ ای۔ این، یونیورسٹی، سکنڈری بورڈ اور مختلف تعلیمی اور علمی اداروں سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ امسال اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

ندوی صاحب کے گھر کو غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ مقامی اور باہر سے آنے والے ادیب، شاعر، انشا پرداز اور محقق وہاں جا کر اس بزرگ ادیب سے شرف ملاقات حاصل کرنا مقدس فرض سمجھتے تھے۔ نجیب اشرف ندوی کی وفات سے اردو ادب میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پُر ہونا آسان نہیں ہے۔

اسلام الدین قریشی

ہماری زبان میں غالب

(گذشتہ سے پیوستہ)

۱۶۔	غالب کا ایک قطعہ تاریخ وفات (مراسلہ)	اکبر علی خاں رامپور	۶۸-۲-۲۲
۱۷۔	غالب میموریل عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے صدر جمہوریہ کی تقریر	نئی دہلی	۶۸-۳-۱
۱۸۔	غالب نے آنے والی نسلوں کو نیا انداز فکر جدید رجحان اور ترقی پسند شعور بخشا	لکھنؤ	۶۸-۳-۱
۱۹۔	انجمن ترقی اردو دہلی میں یوم غالب	دلّی	۶۸-۳-۱
۲۰۔	انجمن ترقی اردو بنارس میں یوم غالب	بنارس	۶۸-۳-۱
۲۱۔	نثار احمد صدیقی کے مراسلے کے بارے میں (بجواب ہماری زبان ۸ فروری ۶۸ء) ایک دعوت فکر		۶۸-۳-۸
۲۲۔	جموں و کشمیر میں جشن غالب کمیٹی کا قیام	جموں	۶۸-۳-۸
۲۳	بیرن پور میں یوم غالب	بیرن پور بنگال	۶۸-۳-۸
۲۴۔	اودے پور میں یوم غالب	اودے پور	۶۸-۳-۸
۲۵۔	صد سالہ جشن غالب کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کا پروگرام	بنگال	۶۸-۳-۸
۲۶۔	مشاعرہ بسلسلہ جشن صد سالہ غالب	بنارس	۶۸-۳-۸
۲۷۔	اردو نگر (اداریہ) بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب / تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں	علی گڑھ	۶۸-۳-۲۲
۲۸۔	غالب کے کلام کا بنگلہ میں ترجمہ	کلکتہ	۶۸-۳-۲۲
۲۹۔	بریلی میں یوم غالب کا پروگرام	بریلی	۶۸-۳-۲۲
۳۰۔	بہار میں جشن غالب کی تیاری	آرہ بہار	۶۸-۳-۲۲
۳۱۔	مشاعرہ بیاد غالب	حیدرآباد	۶۸-۳-۲۲
۳۲۔	شاہ جہاں پور میں یوم غالب	شاہجہاں پور	۶۸-۳-۲۲
۳۳۔	بیاد غالب	پاکستان	۶۸-۴-۲۲
۳۴۔	مولانا آزاد کی یاد میں نمائش مولانا کا انگریزی میں لکھا ہوا غالب پر تبصرہ بھی دکھایا گیا ہے بحوالہ پیٹریاٹ انگریزی روزنامہ بتاریخ ۱۹ اپریل ۱۹۶۸ء	نئی دہلی	۶۸-۴-۲۲
۳۵۔	شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی میں شمس الرحمن فاروقی کا مقالہ "گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے / جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے"	علی گڑھ	۶۸-۴-۲۲
۳۶۔	انجمن کے تازہ فیصلے اور اردو گھر کی تعمیر کی مہم۔ (۱) غالب کی سو برسی کے موقع پر انجمن کتابیں شایع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے	علی گڑھ	۶۸-۵-۱
۳۷۔	بہار کی یونی نظم "غالب سے" آغوش کو اس کی جبیں قریب دو دو دیا"	وصف الاکرم	۶۸-۵-۱
۳۸۔	نذر غالب	انیس انور	۶۸-۵-۸
۳۹۔	پنسلوں پر مرزا غالب کی تصویر	کراچی	۶۸-۵-۱۵
۴۰۔	یہ غزل کس کی ہے (تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ غزل غالب کی ہے یا ناظم کی)	نثار احمد صدیقی	۶۸-۵-۱۵
۴۱۔	ایک گذارش (دیکھئے مرزا غالب کی زندگی پر ڈرامہ فلمبند کرنے کے سلسلے میں اس ڈرامہ کے حالات درکار ہیں)	ڈی۔ اے۔ پیرسن	۶۸-۵-۱۵
۴۲۔	انجمن کی شاخ خیابا پوکھر کلکتہ کا غالب انعامی مقابلہ	ادریس انور	۶۸-۵-۱۵
۴۳۔	پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے	ڈاکٹر سید محمد حسن	۶۸-۵-۲۲
۴۴۔	صد سالہ جشن غالب کی جھلکیاں	نئی دہلی	۶۸-۶-۱
۴۵۔	غالب نگر	سید دلدار حسین	۶۸-۶-۱
۴۶۔	انجمن ترقی اردو دربھنگہ کے زیر اہتمام یوم غالب	دربھنگہ	۶۸-۶-۱۵
۴۷۔	بتیا میں ایوان غالب کا قیام	محمد نصیر الدین	۶۸-۶-۱۵
۴۸۔	علی گڑھ میگزین غالب نمبر	علی گڑھ	۶۸-۶-۲۲
۴۹۔	بیرون ممالک میں غالب کی سویں برسی کی تیاریاں	سیاست	۶۸-۷-۱
۵۰۔	غالب کا ایک قطعہ (مراسلہ)	محمد عباس طالب صفوی	۶۸-۷-۱
۵۱۔	اتر پردیش غالب کمیٹی کے زیر اہتمام کلچرل وفد کٹھمنڈو جائے گا۔	لکھنؤ	۶۸-۷-۸
۵۲۔	غالب کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کا ایک خط	محمد عبداللہ قریشی	۶۸-۷-۸
۵۳۔	مرکزی غالب کمیٹی سے	گیان چند	۶۸-۷-۸
۵۴۔	مدھیہ پردیش میں غالب کی سویں برسی کی تیاریاں۔	آفاق احمد	۶۸-۷-۸
۵۵۔	غالب کا ایک ادیب شمس العلما ذکاء اللہ دہلوی۔	اکبر علی خاں	۶۸-۷-۱۵
۵۶۔	میر منشی دل رضا غالب کا گم شدہ مکتوب (مالک رام)	آل احمد سرور	۶۸-۷-۲۲

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

ہمارے یہاں پچھلے چند برسوں سے نئے اور پرانے ادب کی آویزش کے سلسلے میں جو دھواں دھار بحثیں چل رہی ہیں ان سب کی تان لے دے کر شاعری پر ٹوٹتی ہے۔ نیا طرزِ احساس، نیا ذہنی رویّہ، نیا پیرایۂ اظہار، نیا لہجہ، نئی علامتیں، نئے تلازمے نئے استعارے جیسے ادبی تمغے بھی نئے شاعروں کے ہی سینے پر آویزاں کئے جا رہے ہیں اور سماجی زندگی سے گریز، انفرادیت پرستی، قنوطیت ابہام، اہمال اور مریضانہ لذت پسندی جیسی بیسیوں اصطلاحوں کی مدد سے جو فردِ جرم تیار کی جاری ہے اس کا رخ بھی نئے شاعر اور صرف نئے شاعر کی طرف ہے ایسا کیوں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اردو افسانے میں ادھر کوئی نیا موڑ یا نقطۂ انحراف آیا ہی نہ ہو یا ادھر میں تنقید نگاری کا دائرہ سمٹتے سمٹتے اب صرف شاعری اور وہ بھی نئی شاعری تک محدود ہو کر رہ گیا ہو؟

ہمارے یہاں ۱۹۳۰ء کے بعد جب نئی ادبی تحریک سامنے آئی تو سب سے پہلے جس کتاب نے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا وہ "انگارے" تھی یہ ایک جماعتی کوشش تھی جس میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانے شامل تھے۔ یہ افسانے جس دور میں لکھے گئے اس وقت ہمارے افسانوی ادب پر پریم چند، سدرشن، علی عباس حسینی، سجاد حیدر یلدرم، حجاب امتیاز علی، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور چودھری محمد علی ردولوی جیسے کہنہ مشق اور پختہ کار افسانہ نویس چھائے ہوئے تھے۔ ان افسانہ نویسوں کے مقابلے میں "انگارے" کے مصنفین بالکل نو آموز تھے اور ان کی کہانیوں میں ادھ کچرا پن بھی نمایاں تھا لیکن ان افسانوں سے ہماری ادبی دنیا میں جو ہلچل مچی وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس ہلچل سے فائدہ یہ ہوا کہ اردو افسانے کو ایک نئی سمت مل گئی اور کچھ ہی وقفے کے بعد سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، محمد حسن عسکری، اختر انصاری، اوپندر ناتھ اشک، غلام عباس، دیوندر ستیارتھی، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، دھرم پرکاش آنند، مدھوسودن، بلونت سنگھ، قرۃ العین حیدر اور اس طرح کے دوسرے درجنوں افسانہ نگاروں نے اردو ادب میں اعتبار و افتخار حاصل کیا۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس زمانے میں شاعری، افسانہ اور تنقید تینوں اصناف نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے بے حد قریب تھیں بلکہ نئے ادبی رجحانات اور نئے فنی تجربوں یا نئے ذہنی رویّوں کی مکمل تصویر اس وقت تک بن ہی نہیں سکتی تھی جب تک ہم ان تینوں اصناف کو ایک ساتھ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ تنقید و تجزیہ، سہ ماہی یا سالانہ جائزہ، انتخابات، ادیبوں پر تعارفی مضامین اور اس طرح کی تمام تحریریں الگ الگ دائروں میں نہیں تھیں بلکہ ایک دوسرے سے مربوط و ہم رشتہ تھیں۔ "ادبی دنیا" میں میراجی نے نئی نظموں کے تجزیہ و تفہیم کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا تو ساتھ ہی ساتھ صلاح الدین احمد نئے افسانے پر یہی عمل کر رہے تھے۔ نئے زاویے کی دونوں جلدیں نئی شاعری، نیا افسانہ اور نئی تنقید کا احاطہ کرتی تھیں محمد حسن عسکری نے "میری بہترین نظم" کے ساتھ ہی ساتھ "میرا بہترین افسانہ" بھی مرتب کیا۔ اگر کچھ لوگوں نے اپنی تنقید کو نئی شاعری کے لئے مخصوص کر لیا تھا تو ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے نئے افسانے کو خاص طور پر اپنے تنقیدی مطالعے کا موضوع بنایا مثلاً وقار عظیم نے "نیا افسانہ" کے عنوان سے کتاب لکھی اور ممتاز شیریں نے نہ صرف یہ کہ اپنے رسالہ "نیا دور" میں افسانوی ادب کا سہ ماہی جائزہ لینا شروع کیا بلکہ "تکنیک کا تنوع" اور "اردو افسانے پر مغرب کا اثر" جیسے معرکے کے مضامین لکھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہمارے یہاں کی شاعری کا بھی بعض تبدیلیاں

حرمت الاکرام

غزل

ظلمت و نور کا ہر خواب پگھل جاتا ہے
کبھی خاور کبھی مہتاب پگھل جاتا ہے

سرِ محراب ازل ہے کوئی شب تاب کرن
کوئی سجدہ تہِ محراب پگھل جاتا ہے

کون جانے کبھی شبنم نے یہ سوچا کہ نہیں؟
کیوں یہ ہر گوہرِ خوش آب پگھل جاتا ہے

بجھتے شعلوں میں کہاں اتنی حرارت باقی
خود ہی اکثر دلِ بیتاب پگھل جاتا ہے

چشمِ بے خواب کو دو کوئی جواب بے صبح
رات ڈھل جاتی ہے مہتاب پگھل جاتا ہے

ڈوبنا سیکھ لو پہلے تو بتاؤں تم کو
کس طرح وقت کا گرداب پگھل جاتا ہے

تپشِ فکر سے لرزاں ہوں کہ اکثر حرمت
فقط اک آنچ سے ہر خواب پگھل جاتا ہے

سے دو چار ہوئی اور افسانہ بھی مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تنقید نے آہستہ آہستہ افسانوی ادب اور اس کے مسائل سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اکا دکا مضامین لکھے بھی گئے تو ان کا نہ تو پڑھنے والوں نے کوئی خاص اثر قبول کیا اور نہ افسانہ نگاروں پر اس کا ردعمل ہوا مثلاً ۱۹۵۱ء کے لگ بھگ محمد حسن عسکری نے "اردو افسانے کا مستقبل" کے عنوان سے ایک فکر انگیز مضمون لکھا تھا جس میں اس خطرے کا اظہار کیا تھا کہ ہمارا افسانہ پھر رومانیت کی طرف واپس جا رہا ہے۔ اس مضمون پر کوئی بحث نہیں ہوئی۔ انتظار حسین نے "اجتماعی تہذیب اور افسانہ" کے عنوان سے ایک معرکے کا مضمون لکھا تھا اس مضمون کے بعد بھی سناٹا رہا۔ ۱۹۶۳ء میں دہلی سے ایک رسالہ "تلاش" نکلتا تھا اس میں محمود ہاشمی نے "تخلیقی افسانے کا فن" کے عنوان سے ایک بے حد چونکا دینے والا مضمون شائع کیا اس پر صرف دیویندر ستیارتھی کا ایک خط اور دو ایک منحنی سی آوازیں سننے میں آئیں پھر وہی خاموشی۔

نئی شاعری سے متعلق ادھر کئی اہم اور خیال انگیز کتابیں شائع ہوئی ہیں مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "نظم جدید کی کروٹیں" اور "اردو شاعری کا مزاج" سلیم احمد کی "نئی نظم اور پورا آدمی" جیلانی کامران کی "نئی نظم کے تقاضے" اعتماد جالب کی مرتب کردہ کتاب "جدید شاعری" جس میں مختلف اصحاب کے مضامین شامل ہیں، مگر ہمارے افسانوی ادب پر اس طرح کی مفصل تنقیدیں اب نہیں لکھی جا رہی ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ افسانے یا ناول میں نئے رجحانات سامنے نہ آئے ہوں۔ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی" خدیجہ مستور کا "آنگن" رضیہ فصیح احمد کا "آبلہ پا" جمیلہ ہاشمی کا "تلاش بہاراں" ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی" جیسے ضخیم اور بڑے کینوس پر لکھے گئے ناول زمانہ حال کی ہی پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ مختصر افسانہ بھی چند نئی جہتوں سے آشنا ہوا ہے۔

قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین، ضمیر الدین احمد، اشفاق احمد، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، انور سجاد، الطاف فاطمہ، سید خلیل احمد، غلام علی چودھری، حمید کاشمیری، رحمان مذنب، خالدہ اصغر، غلام الثقلین نقوی، رام لعل، جوگندر پال، اقبال متین، عوض سعید، محمد عمر میمن، غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش، بلراج مینرا اور اس کے علاوہ درجنوں ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں ہمیں نیا ذہنی رد عمل اور افسانوی تکنیک کے نئے تجربے ملتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کو سمجھنے کے لئے اب وقار عظیم یا ممتاز شیریں کی تنقیدیں کام نہیں آسکتیں۔

ایک شکایت مجھے نئے افسانہ نگاروں سے بھی ہے۔ ادب کی کوئی بھی صنف ہو اس کے تخلیقی اور فنی مسائل سے خود ان لوگوں کو سب سے پہلے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے جو خود اس کے عامل ہیں۔ نئے افسانہ نگار اگر اپنے تخلیقی اور فنی مسائل پر بھی کبھی کبھار لکھا کریں اور بحث مباحثے کے دروازے کھولنے کی کوشش کریں تو دوسرے لوگوں کو بھی ان مسائل پر سوچنے کی تحریک ہو سکتی ہے لیکن اب ہمارا افسانہ نگار افسانے لکھ کر چھپوا لیتا ہے اور کسی نقاد کے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے جو اس کے افسانے کی معنویت دوسروں کو سمجھائے اور اس کے کارنامے کی داد دے۔ خالص نقادوں پر اس قدر تکیہ کرنا میرے نزدیک درست نہیں۔ ہمارے نئے افسانہ نگار اگر کوئی بحث چھیڑتے بھی ہیں تو یہ کہ ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا جا رہا ہے یا فلاں صاحب کی فہرست میں ہمارا نام نہیں ہے میرا خیال ہے کہ نئے افسانے کے بنیادی مسائل یہ نہیں ہیں کہ نقاد کس کا نام لیتے ہیں اور کس کو نظر انداز کرتے ہیں۔ نئے افسانے کو نئی زندگی اور نئے طرز احساس کے پس منظر میں ابھارنے کی ضرورت ہے، نئے افسانوں کے اچھے انتخابات سامنے آنے چاہئیں۔ خود نئے افسانہ نگاروں کو نئے افسانے کی تنقید و تجزیہ کی ابتدا کرنی ہوگی۔ اس کے بغیر نئے افسانوی ادب کی اہمیت اور معنویت پر پوری توجہ نہ ہو سکے گی جس سے عام قاری کے علاوہ نئے افسانہ نگاروں کا بھی نقصان ہو سکتا ہے۔

مراسلات

استادِ غالب کے سلسلے میں

منشی درگا پرشاد نادر دہلوی نے اپنی کتاب "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" (مطبع مفید عام، لاہور، ۱۸۸۹ء) میں صفحہ ۲۰۸ پر لکھا ہے:

"غالب جو اپنے تئیں شاگردِ خالق اور استادِ محفوظ سمجھتے رہے ہیں، ان کی نسبت صاحبِ "گلستانِ بےخزاں" نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ شخص نظیر اکبرآبادی اور اس کے بیٹے میر گلزار علی اسیر کے شاگرد ہیں۔ میں نے (نادر نے) جو ایک دو شاعر عمر رسیدہ سے سن کر ان کو نظیر کا شاگرد لکھا ہے تو اکثر شعرائے دہلی نے کہا کہ یہ بھی غلط ہے۔ واقعی غالب نے اشعار اردو کی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ غرضیکہ شائقین کتاب مذکورۂ بالا کو ملاحظہ فرمائیں تو اس کا لطف اٹھائیں، نہ مجھے یارائے مقابلہ و مجادلہ، نہ میرے اس کاغذِ ناکارہ میں اس کی تحریر و تقریر کا گزارہ۔ العاقل تکفیہ الاشارہ۔ ہاں دلی کے ایک شخص منشی کنھیا لال صاحب وحشیؔ تخلص نے اس کا مختصر سا جواب الجواب چھپوایا ہے وہ بھی ملاحظہ کے لائق ہے۔"

قارئین ہماری زبان سے یہ التماس ہے کہ کنھیا لال وحشیؔ کا مذکورۂ بالا رسالہ جو انھوں نے "گلستانِ بےخزاں" کے رد میں اور غالب کے شاگردِ نظیر اکبرآبادی نہ ہونے کے اثبات میں لکھا تھا، کہیں نظر سے گزرا ہو تو اس کی نشاندہی کریں۔

(نعیم احمد، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ایک تجویز

میں ہفتہ وار ہماری زبان کو ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں امید ہے کہ کارگر ثابت ہوگی اور پسند کی جائے گی۔ وہ تجویز یہ ہے کہ غالب کی صد سالہ برسی کے پرمسرت موقع پر ہماری زبان بھی غالب نمبر کا اجرا کرے۔ اور دوسری تجویز یہ ہے کہ ایک ایسا ماہنامہ رسالہ نکالا جائے کہ جس میں نئے ادبا و شعرا اپنی تخلیقات شائع کرا سکیں۔ کیونکہ بڑے بڑے اخبار و رسائل نئے لکھنے والوں کو چانس ہی نہیں دیتے اور اس ماہنامہ کا نام "آہنگِ نو" رکھا جائے۔

(محمد خالد، بوا محل روڈ بھوپال)

نظم مجبوری کے بارے میں

اس وقت میرے سامنے ہماری زبان کا مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۶۸ء کا شمارہ ہے اور اسی سلسلے میں مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے تاکہ اگر مجھے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو تو وہ آپ کے ذریعہ جواب پا کر رفع ہو جائے۔

شمارہ ہذا کے صفحہ ۵ پر جناب ساجد اثر صاحب کی نظم "مجبوری" شائع ہوئی ہے۔ اس نظم کے سلسلے میں کچھ گوش گذار کر رہا ہوں۔

اولین چیز اور خاص بات یہ ہے کہ نظم اثر صاحب نے کسی "وزن" کا التزام رکھتے ہوئے لکھی ہے یا "بے وزن" ہے۔ اگر "بے وزن" ہے تو مجھے کچھ نہیں کہنا ہے! اور اگر اثر صاحب نے کسی وزن کا التزام رکھا ہے جیسا کہ نظم کے آہنگ سے ظاہر ہے تو نظم کو اس کے "ارکان" "وزن" کا التزام رکھتے ہوئے کیوں نہیں لکھا گیا؟ نظم کے خیالات و جذبات کے برعکس (ویسے نظم خاصی فکر انگیز ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناظم نے دانستگی یا نادانستگی میں نظم کو اس کے "ارکان" یا "وزن" کے مطابق نہ لکھ کر یوں ہی لکھ دیا ہے جس سے کم وزن کے ارکان مجروح ہوتے ہیں۔

(ذوالقدر خان خاطر حافظی گورکھپوری)

تصویرِ غم کے بارے میں

۸ر اگست کے ہماری زبان میں "تصویرِ غم" کے عنوان سے کسی عبید اللہ صاحب کا مراسلہ میری نظر سے گزرا جس میں فاضل مراسلہ نگار نے میرے مضمون تصویرِ غم زین آباد (صدی مئی ۶۰ء) اور پروفیسر شیخ فرید کے مضمون "تاج محل" (اردو ادب علی گڑھ ۶۵ء) میں کچھ سطور کی مماثلت کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ محترم شیخ فرید کی تھیسس اور کچھ دوسرے ضروری کاغذات جو ۱۹۵۰ء میں کسی سفر میں گم ہوئے تھے، وہ میرے ہاتھ لگ گئے ہیں جن سے استفادہ کر کے میں نے زیرِ بحث مضمون لکھا ہے۔ میرے مضمون کا ماخذ محترم شیخ فرید کا مضمون "تاج محل" اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی دو کتابیں تھیں جن کا حوالہ میں نے اپنے مضمون کے ساتھ ایڈیٹر کو لکھے گئے خط میں دیدیا تھا اس لئے مماثلت کا ہونا ضروری تھا۔ جہاں تک تھیسس اور ضروری کاغذات کی گمشدگی کا سوال ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ محترم عبید اللہ صاحب کو یہ سوچنا چاہئے کہ کوئی کسی کی تھیسس پا کر اس سے مضمون لکھنے کی حماقت نہیں کرے گا بلکہ وہ ڈگری حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

(موسیٰ مجروح)

اردو میں عقلیت پسندی کے دھارے

مہدی افادی کے مقالات "افادات مہدی" میں بعض ایسی غیر معمولی چیزیں نظر آتی ہیں جن کی طرف یا تو اردو ادیبوں، ادب دوستوں اور ناقدوں نے توجہ ہی نہیں دی۔ یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اردو ادب میں عقلیت پسندی کی اس اہم رو کا ذکر بیحد ضروری ہے، اور کتنا پہلے لکھا ہے جبکہ غالباً یہ ۱۹۰۵ء کی بات ہے جب وہ لکھتے ہیں۔

"انیسویں صدی کے ایک بہت بڑے عالم کے خیال کے مطابق مذہب کے دو حصے ہو سکتے ہیں اعتقادی اور عملی۔ الٰہیات کا زیادہ تر حصہ صرف مختصر اقسام سوسائٹی اور اس کی وقتی ضروریات ہوا کرتی ہیں۔۔۔ روشن خیال علمائے اسلام کا خیال ہے کہ شرائع ضروریات انسانی کے تابع ہیں، جس طرح ضروریات انسانی بدلتی رہتی ہیں شرائع میں بھی ریفارم کے سے تدریجی گھٹنے بڑھنے کی خاصیت موجود ہے کیونکہ اصولاً اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ادنیٰ ان لوگوں کی دماغی قابلیت اور گرد و پیش کے حالات کے مطابق ہو لیتا ہے جو اسے قبول کرتے ہیں اور بعد میں ان کی دماغی اور اخلاقی سطح کو بلند کرتا ہے یعنی اسلام ایک ترقی پذیر مذہب ہے۔۔۔۔

"تمدنی امور میں میرے نزدیک مذہب کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں ہمارے افعال کو صرف حیثیت افادی اور فوائد اخلاقی کا تابع ہونا چاہئے یہی اصولی موضوع آج شائستہ اور مہذب دنیا کی ترقیات کا عنوان ہے ایک کام کو اس لئے کیجئے کہ اس میں بمقابلہ ضرر اس کے فوائد کے پہلو زیادہ ہیں اور یہ کردہ فی نفسہٖ اچھا ہے اور چونکہ ہر فعل خود اپنی مکافات ہے، میں نہیں جانتا اخلاقی منظوری کے سوا کسی اور منظوری کی ضرورت ہے! یہی حیثیت افادی ہے جس کا مذاق یورپ میں رچ گیا ہے۔۔۔

"یونانیوں کا تخیل صرف تکمیل انسانیت تھا، یعنی وہ ہستی موجودہ سے آگے نہیں جاتے تھے۔ ان کے خیال میں قوائے فطری کی کامل نشو و نما اور ان کا معتدل استعمال جس میں غایت زندگی تھی یہی خیال شاگردانہ حیثیت سے یورپ نے حاصل کیا۔ یورپ کا موجودہ تمدن اسی خیال کا نتیجہ ہے۔ برخلاف اس کے ہم آج تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہماری ہستی جو گہوارے سے شروع ہوتی ہے اور بہ حیثیت موجودہ یقینی قبر سے پہلے ختم ہو جائے گی، ایک حرف غلط ہے ترقی کا افتتاح آغوش لحد میں پہنچ کر ہوگا۔ میں نہیں جانتا ان خیالات کے ساتھ کوئی قوم کہاں تک متمدن اقوام سے ہم سطح ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے!

"۔۔۔ پردہ ایک نہایت قدیم رسم ہے جو مختلف اقوام و ملل میں دستور و شعاری ہے جس کو اسلام کے ساتھ کوئی تخصیص نہیں۔۔۔ ہر زمانہ میں عورت ایک اضافی اور ضمنی شے سمجھی گئی جو محض حصول لذت کے لئے مردوں کے نفسانی جذبات کا تختۂ مشق بنتی رہی۔۔۔۔۔۔۔ جب اس کے اچھے دن تھے تب بھی وہ اپنے آقا کا ایک ضمیمہ یعنی زیادہ سے زیادہ کنیز تھی۔۔۔۔۔۔

"آج کل زمانہ تزاحم فی الحیات کے سلسلے میں جکڑا ہوا ہے۔۔ جس کے لئے ہم کو سب سے پہلے یہ کرنا ہے کہ مردوں کے پہلو بہ پہلو عورتوں کی جسمی، اخلاقی اور دماغی قوتوں کو کامل نشو و نما اور ترقی دی جائے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ گرفتاران قفس یعنی عورتیں پردہ کی اوٹ سے باہر نہ آئیں!

"۔۔۔۔ میں نہیں جانتا اختلاف جنس کے سوا مرد و عورت میں کوئی تفریق ممکن ہے۔ عورت مرد کی طرح فطرۃً ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور وہ اپنے افعال و خود ارادے میں اتنی ہی آزاد ہے جس قدر اس کا فرد مقابل۔ اس لئے انسانی پیداوار کے نصف بہتر حصے کی روپوشی یعنی ناک کان چھید کر گھر کی چار دیواری میں نظر بند رکھنا، ایک طرح کا غیر ضروری تعطل اور واضع آئین فطرت کی غایت اصلی کے لحاظ سے بالکل غیر طبعی امر ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری عورتیں اپنے نصیبۂ قسمت یعنی دائم الحبس رہنے پر رضامند ہیں ان کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ یہ رضا اگر ہو ایسی ہی ہوگی جس طرح پرشکستہ طائر قفس اپنی محدود وسعت پر قانع ہوتا ہے۔۔۔۔۔ مختصر یہ کہ بیسویں صدی کے تمدن کی طرف سے یہ امر بلا خوف تردید پیش کیا جا سکتا ہے کہ صنف نازک کا چہرہ اور ہاتھ ستر عورت نہیں ہے۔۔۔۔

"ہم کو اپنے آئندہ نسل کی ترقی کے لئے یہ کرنا ہے کہ جن گہواروں میں ان کی ابتدائی نشو و نما ہو وہ نمونۂ شائستگی اور دماغی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ہر طرح کے قوائے لطیفہ سے آراستہ و پیراستہ ہوں، اور یہ قطعاً ممکن نہیں جب تک موجودہ گھونگھٹ کو خیرباد نہ کہا جائے۔

"عورتوں کی آزادی کے خلاف جو شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں ان میں آزادی کا جو فی نفسہٖ اچھی چیز ہے ہمیشہ غلط استعمال ہوا ہوگا اس کی روک تھام کرنی ہوگی بے شک! یہ ایک دن کا کام نہیں، نہ یہ منظور ہے کہ کل کا ہونا آج ہی سب کچھ ہو جائے مگر اصولاً ہم کو ایک بات طے کر لینی چاہئے!" (از مرتب)

غالب کو وزیر اعظم کا خراج تحسین

نئی دہلی: وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کہا کہ اردو کے مشہور شاعر غالب حیات جاوید حاصل کرنے والے شاعروں میں سے ایک ہیں غالب کی شاعری سے زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کے گہرے مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ بات اس پیغام میں کہی ہے جو انھوں نے بمبئی یادگار کمیٹی کو روانہ کیا ہے۔ مسز گاندھی کل ہند غالب صد سالہ تقریب کمیٹی کی بھی چیرمین ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک شاعر کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خراج تحسین ہوگا کہ اس کا کلام عوام کے کلچر میں شامل ہو جائے۔ انھوں نے بہت پر آشوب زمانہ دیکھا تھا جس کی جھلک ان کے کلام میں پائی جاتی ہے ان کا پر اثر کلام عوام کی زندگی کا جز بن گیا ہے۔ اور ان کے خوبصورت اشعار کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے۔ کسی شاعر کی عام مقبولیت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ (قومی آواز)

بمبئی میں غالب ٹرافی کے لئے مباحثہ

بمبئی گذشتہ ہفتہ سینٹ زیویر کالج کے آڈیٹوریم میں مرزا غالب اردو ٹرافی کے لئے ایک شاندار تقریری مقابلہ منعقد ہوا جس میں بمبئی ضلع کے ۷ کالجوں جہاراشٹر کالج، اسمٰعیل یوسف کالج، صوفیہ کالج، سدھارتھ کالج، سینٹ زیویر کالج اور مہارشی دیانند کالج کے طلبہ نے حصہ لیا۔ تقریب کی صدارت اکبر پیر بھائی نے انجام دی ججوں میں مشہور شاعر کیفی اعظمی بھی شامل تھے۔ احل آنے دیا ایم۔ ڈی کالج کے طلبہ کی تقاریر کو بہت سراہا گیا۔ جن دیگر کالجوں کو انعام دیا گیا ہے ان میں اسمٰعیل یوسف کالج (سکنڈ پرائز) اور سینٹ زیویر کالج (رعایتی پرائز) شامل ہیں۔ (ہندوستان)

مدراس میں غالب کی صد سالہ برسی کا پروگرام

مدراس جمال محمد کالج ترچناپلی صوبہ مدراس کی اردو اسوسیئشن نے یہ طے کیا ہے کہ غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں ایک سمینار اور مشاعرے کا انتظام کرے۔ تقریبات کی تفصیل یہ ہے۔ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۶۸ء دوپہر میں دو بجے سے ساڑھے چار بجے تک "غالب سمپوزیم" ہندوستان کی مختلف زبانوں میں غالب پر مقالے پڑھے جائیں گے۔ پانچ بجے سے چھ بجے تک غالب کی زندگی پر ایک مختصر ڈرامہ پیش کیا جائے گا۔ چھ سے ساڑھے سات بجے تک "محفل نغمہ" ہوگی جس میں جنوبی ہند کے قد آور موسیقار غالب کی غزلوں کو ساز و آہنگ کے ساتھ پیش کریں گے۔ اسی شب کو دس بجے سے کل ہند مشاعرہ ہوگا جس میں مقامی اور بیرونی شعراء شرکت فرمائیں گے۔ ان تقریبات میں جنوبی ہند کے کالجوں کے اردو شعبہ جات کے اساتذہ اور طلبہ شرکت فرمائیں گے۔ جو مقالے سمپوزیم میں پڑھے جائیں گے ان کو ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں کالج لائبریری ہال میں "غالب نمائش" ترتیب دی جائے گی۔ جس میں غالب سے متعلق مختلف کتابیں اور تصویریں رکھی جائیں گی "مرزا غالب" فلم شو کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ (حسرت سہروردی)

کشمیر میں غالب صد سالہ کمیٹی کے زیر اہتمام شام قوالی

جموں، غالب صد سالہ کمیٹی جموں کے زیر اہتمام گلاب بھون میں ایک شام قوالی منعقد کی گئی۔ مہمانوں میں گجندر گڈکر کمیشن کے ممبران جناب بدرالدین طیب جی اور جناب شنکر پرشاد اور سکریٹری بی۔ پی باگچی بھی موجود تھے۔ یہ پروگرام غالب صد سالہ تقریبات کے حصے کے طور پر غالب صد سالہ کمیٹی نے گورنمنٹ آف انڈیا کے فیلڈ پبلسٹی یونٹ کے اشتراک سے ترتیب دیا تھا۔ (سکریٹری)

ہندوستان کی ذہنی و سائنسی ترقی میں ہندی کا حصہ برائے نام

جلسہ تقسیم اسناد میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کا خطبہ

کلکتہ: ممتاز زبان داں اور علوم انسانی کے نیشنل پروفیسر ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے ہندوستانی تعلیم میں انگریزی کو لازمی مضمون کے طور پر برقرار رکھنے کی وکالت کی ہے۔ انھوں نے کلکتہ یونی ورسٹی کے سالانہ کانوکیشن سے خطاب کرتے ہوئے مادری زبان انگریزی اور ایک تیسری زبان کا خواہ وہ قومی ہو یا بیرونی مطالعہ لازمی قرار دیا جائے۔ ڈاکٹر چٹرجی نے تجویز پیش کی کہ اسکول کی دس سالہ تعلیم کالج کی چار سالہ تعلیم اور تین سالہ پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا نظام بحال کیا جائے۔ انھوں نے سیاسی جماعتوں کو قصوروار قرار دیا کہ وہ طلبہ کو اپنے ناپاک جماعتی مفاد کے لئے استعمال کر رہی ہیں اور وہ الستہ طور پر بدقسمت اور مایوس طلبہ کو گھٹیا نعروں اور غلط سلط باتوں سے گمراہ کر رہی ہیں ڈاکٹر چٹرجی نے رفتہ رفتہ تعلیم کے معیار کے گرنے پر افسوس کرتے ہوئے کہا کہ میرے خیال میں بہت سے مضامین کا حد سے زیادہ بوجھ اور تعلیمی منصوبوں کے غیر ذمہ دارانہ اور بے لگام تجربہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ میں مرکزی حکومت سے انکساری کے ساتھ درخواست کروں گا کہ وہ لوگوں کے ایک چھوٹے گروہ کے جو ہندی بولتا یا استعمال کرتا ہے اور جس کا حالیہ صدیوں میں ہندوستان کی ذہنی اور سائنسی ترقی میں حصہ بالکل برائے نام رہا ہے اصرار و خیالات اور جذبات کا احترام کرنے کے لئے ہماری قومی زندگی کی اچھی اور قابل قدر چیزوں کو تباہ نہ کرے۔ ہندی کی تعصب ایک زبان ہو نئے

والے لوگوں کو مستقلاً غیر منصفانہ خصوصی مراعات دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں دینے کے مترادف ہوگا۔ آل انڈیا سروسوں کے امتحانات صرف انگریزی میں جاری رکھنا ہوں گے۔ (سیاست)

غازی آباد کی فلمی صنعت میں دوسری زبانوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا

بمبئی: فلمی دنیا کے مشہور و ممتاز اداکار، پروڈیوسر اور ڈائرکٹر جناب سنیل دت نے اپنے سے منسوب اس قسم کے تمام بیانات کو غلط قرار دیا ہے کہ غازی آباد (اتر پردیش) میں قائم ہونے والی فلمی صنعت زبان کے معاملہ میں صرف ہندی کو اپنائے گی۔ انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کی پوری طرح تشریح و توضیح کی اور بتایا کہ بعض ہندی اخبارات نے اپنے طور پر مجھ سے منسوب کر کے متعلقہ بیانات شائع کئے اور انھیں کی وساطت سے دوسرے اخبارات نے ان بیانات کی اشاعت کی۔ یہ ان اخبارات کی اپنی خواہش اور رائے ہو سکتی ہے میری نہیں۔ جہاں تک میرے اپنے نقطۂ نظر کا تعلق ہے میں قومی یکجہتی پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ ہندو، سکھ، عیسائی سب کو ہندوستانی قوم کا حصہ تصور کرتا ہوں اور سب کا برابر کے درجہ عزت و احترام کرتا ہوں اسی طرح زبانوں کے معاملہ میں بھی کسی تنگ نظری کا شکار نہیں ہوں۔ ہندی، اردو اور تمام دوسری درج آئینی زبانیں میرے لئے قابل احترام ہیں اور حسب ضرورت ہم ہر زبان سے فائدہ اٹھائیں گے میرے لئے محض "ہندی نواز" ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(سیاست)

ہندو شاعروں نے اردو کے لئے مسلمانوں سے زیادہ کام کیا ہے

مرادآباد: توڑی جانے والی اتر پردیش اسمبلی کے اسپیکر جگدیش سرن اگروال نے ہندی کو ہندوستان کی رابطہ کی زبان برقرار رکھنے کی وکالت یہاں روٹری کلب میں انگریزی زبان کے ذریعہ کی۔ رتال سے انگریزی بولتے ہوئے انھوں نے اس تضاد پر معذرت کرتے ہوئے کہا کہ روٹری کلب کے ممبران انگریزی ہی بہتر سمجھتے ہیں اور میرے نقطۂ نظر کو اسی زبان کے ذریعہ بہتر سمجھ سکتے ہیں اس لئے میں انگریزی میں بول کر اپنے اس خیال کو پیش کر رہا ہوں کہ انگریزی نہیں بلکہ ہندی رابطہ کی زبان ہو۔ اگروال نے کہا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کے اعلان کے فوراً بعد ہندی کو عام زبان بنانے کے بارے میں دستور ساز اسمبلی کے فیصلہ کو عملی جامہ نہ پہنا کر بہت بڑی غلطی کی گئی تھی ہمارے سامنے ترکی کی مثال ہے جس نے حصول آزادی کے فوراً بعد ترک زبان کو قومی زبان قرار دینے میں پس و پیش نہیں کیا تھا۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو یہ سوال متنازعہ نہ بنتا جیسا کہ آج بنا ہوا ہے۔ انھوں نے ہندی کے شیدائیوں سے اس بات پر ٹھنڈے دل سے سوچنے کی اپیل کی کہ راجاجی جیسے پایہ کا لیڈر جس نے اس زمانہ میں جب وہ مدراس کے وزیر اعلیٰ تھے، ہندی کی تعلیم کو لازمی قرار دیا تھا۔ آج ہندی کے شدید مخالف ہیں۔ آج ہندی کے حامیوں میں کچھ خامی ہے جس کے باعث دکنی ہندوستان والے ہندی کو عام زبان نہیں تسلیم کرتے۔ انگریزی سائن بورڈ جلانے اور ہندی کے نام پر تشدد کا ارتکاب کرنے سے وہ اپنے نصب العین کے ایک انچ بھی قریب نہ پہونچیں گے۔ صبر و پیار سے ہندی کو غیر ہندی لوگوں کے لئے قابل قبول بنایا جا سکتا ہے۔ ہندی کی خاطر جنگ غیر ہندی ریاستوں میں ہونی چاہئے۔ ہندی بولنے والی ریاستوں میں نہیں۔ انگریزی کے متعلق اگروال نے کہا کہ یہ خیال غلط ہے کہ سائنس میں ترقی انگریزی کے بغیر ناممکن ہے۔ روس والے سائنسی اعتبار سے آج دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں لیکن انھوں نے سائنس اپنی زبان کے ذریعہ پڑھی۔ انگریزی کو لائبریری کی زبان کے طور پر برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ یہ دنیا کا منظر پیش کرنے والی واحد کھڑکی نہیں ہے۔ بلکہ کئی کھڑکیوں میں سے ایک ہے انھوں نے اردو کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ یہ کہنا بیوقوفی کی بات ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے درحقیقت ہندو شاعروں نے اس کی ترقی کے لئے مسلمانوں سے زیادہ کام کیا۔ (سیاست)

پی ٹی آئی کا شعبۂ اردو

حیدرآباد، جناب کے کے شاہ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات کو پریس رپورٹرس گلڈ میں منعقدہ تقریب میں پریس انفارمیشن بیورو حیدرآباد سے متعلق اردو سکشن میں توسیع کی ضرورت پر متوجہ کیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ دہلی سے اخبارات کو اشاعت کے لئے مواد بعید تاخیر سے وصول ہوتا ہے جناب شاہ نے کہا کہ یہ مواد بذریعہ طیارہ دہلی سے حیدرآباد بھیجا جاتا ہے جس پر ان کی توجہ اس جانب مبذول کروائی گئی کہ یہ دوسرے اخبارات میں اشاعت کے بعد وصول ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ حیدرآباد کے اردو پی ٹی آئی سکشن میں اضافہ کی ضرورت ہے جس طرح تلگو اور انگریزی میں زیادہ اسٹاف ہے اسی طرح اردو سکشن پی ٹی آئی میں بھی اضافہ کیا جانا چاہئے کیونکہ حیدرآباد سے تیرہ اردو روزنامہ اور ۵۰ ہفتہ وار اور کئی سو کی تعداد میں ماہنامے اجراء ہوتے ہیں۔ جناب شاہ نے اس سلسلہ میں ضروری کارروائی کا یقین دلایا۔ (رہنمائے دکن)

ترقیاتی منصوبہ کی اشاعت کے لئے یوپی میں اردو کا استعمال غیر تسلی بخش

لکھنؤ: حکومت یوپی نے اپنے چوتھے منصوبے کے بارے میں نشر و اشاعت کے لئے ابھی تک اردو زبان کا استعمال نہیں کیا ہے حالانکہ یوپی میں ایک کروڑ افراد کی مادری زبان اردو ہے مولانا شاہد فاخری نے منصوبہ بندی مشاورتی کمیٹی کے ۸ روزہ والے جلسہ میں اس بات پر زور دیا تھا کہ ریاست کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ

کو منصوبہ بندی سے متعلق کتابیں اردو میں بھی شایع کرنا چاہیے۔
تیسرے پنج سالہ منصوبہ میں ریاست کے محکمہ اطلاعات نے صرف چند کتابیں شایع کی تھیں محکمہ منصوبہ بندی اپنی کارکردگی کے متعلق ہندی اور انگریزی میں مبسوط کتابیں شائع کرتا ہے وہ اردو کے سلسلہ میں مکمل خاموش رہا۔ مرکزی سرکار نے ریاستی سرکاروں کو اپنے یہاں کی زبانوں میں کتابیں شایع کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے چوتھے منصوبے کے مسودے میں اردو اخبارات کو اشتہارات دینے کی اسکیم میں اگرچہ تیسرے منصوبہ کے دوران یہ اسکیم تھی۔
(قومی آواز)

پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی وفات پر شعبہ اردو علی گڑھ کا تعزیتی جلسہ

علی گڑھ ۱۱ ستمبر ۶۹ء پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی وفات پر انجمن اردوئے معلی شعبۂ اردو کا ایک تعزیتی جلسہ پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں شعبۂ اردو میں ہوا۔ صدر جلسہ پروفیسر آل احمد سرور نے نجیب اشرف ندوی کے علمی ادبی اور تحقیقی کاموں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی اردو زبان و ادب کے سلسلے میں مرحوم کی خدمات کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ یہاں اردو زبان و ادب کی تعلیم اور تدریس کی ترقی میں ندوی صاحب کی کوششوں کو بہت دخل ہے۔ صدر جلسہ کی تقریر کے بعد تعزیتی تجویز پاس کی گئی۔
(حسن احمد نظامی سکریٹری)

صفحہ ۱۲ کالم ۱ سے آگے

غیر ملکی رہنماؤں اور مفکروں کے خیالات جمع کر دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ "نہرو اور بچے"، "شاعروں کا خراج عقیدت"، "نہرو کے خطوط"، "زبان اور رسم خط کے بارے میں نہرو کے خیالات" "حالات زندگی کی جھلکیاں اور تصانیف" کے زیر عنوان تاثراتی مضامین، موثر نظمیں، اہم خطوط اور اقتباسات شامل کئے گئے ہیں۔ آخر میں حالات زندگی کی اہم تاریخیں اور پنڈت جی کی تصنیفات کے اردو ترجموں اور نہرو نمبروں کا اشاریہ شامل ہے جسے ایم حبیب خاں نے مرتب کیا ہے۔ عبداللطیف اعظمی نے "تکملہ" کے عنوان سے ان اردو تراجم کی نشاندہی کی ہے جو ایم حبیب خاں کے اشاریہ میں جگہ پانے سے رہ گئے تھے۔

کتابت، طباعت، انتخاب اور ترتیب ہر لحاظ سے یہ نمبر قابل تعریف ہے جس کے لئے عبداللطیف اعظمی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

۲۷۲ صفحات کے اس نمبر کی قیمت چار روپے پچھتر پیسے ہے اور یہ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو، علی منزل، کوچہ پنڈت، دہلی ۶ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

-×-×-





تبصرہ

شہریار

سہ ماہی "صبح" :- جواہر لال نہرو نمبر
مرتبہ :- عبد اللطیف اعظمی

ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد سے ہندوستان کی سیاست میں اس حلقہ کا اثر بڑھتا جا رہا ہے جو پنڈت جواہر لعل کی انسان دوست پالیسی سے بنیادی اختلاف رکھتا تھا۔ پنڈت جی کی خارجہ پالیسی سے اس حلقہ کی بے اطمینانی اور ان کی امن پسندی سے بیزاری بڑی حد تک سمجھ میں آتی ہے لیکن ادھر ملک کے ترقی پسند حلقوں میں جس طرح سے پنڈت جی کے کارناموں کو کم کرکے پیش کرنے کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ وہ خاصا خطرناک ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پنڈت جی کے سیاسی کارناموں کو اور ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو اور ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں ان کی خواہشوں اور خوابوں کو معروضی طور پر لیکن اس کے صحیح اور حقیقی پس منظر میں پیش کیا جائے۔ ہندوستان کی مختلف جدید زبانوں میں یہ کام کسی نہ کسی حد تک شروع ہو چکا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ جدید ہندوستانی زبانوں میں اردو زبان و ادب نے جس طرح پنڈت جی سے اپنے کو IDENTIFY کیا ہے کسی اور زبان نے نہیں کیا۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان و ادب جن انسانی اور تہذیبی قدروں اور معیاروں سے عبارت ہے اس کی جلوہ گری اگر کسی ایک ہندوستانی میں نظر آتی ہے تو وہ پنڈت جی کی ذات ہے اپنے محدود وسائل کے باوجود اردو رسائل نے پنڈت جی کی شخصیت اور کارناموں پر جتنے اور جیسے معیاری خاص نمبر شایع کئے ہیں وہ ہر اعتبار سے قابل تعریف ہے۔ ریاستی شاخ دہلی کے سہ ماہی علمی رسالہ "صبح" نے بھی حال میں جو جواہر لعل نہرو نمبر شایع کیا ہے اس نمبر کی ترتیب کے فرائض جناب عبد اللطیف اعظمی نے انجام دئے ہیں۔ اس نمبر میں جہاں مضامین کے موضوعات اور عنوانات کے انتخاب میں جہاں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ پنڈت جی کی شخصیت اور کارناموں کے اہم پہلو ضرور سامنے آ جائیں وہاں ان مضامین کی ترتیب میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا گیا کہ ان سے پنڈت جی کی دلنواز شخصیت اور ان کی گہری فکر اور ہندوستانی عوام کے مسائل اور مستقبل کے خوابوں میں جو تعلق، ربط اور ہم آہنگی ہے وہ بھی ظاہر ہو جائے۔

نمبر کی ترتیب میں سب سے پہلے ان مضامین کو جگہ دی گئی ہے جو سیرت و شخصیت کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس کے بعد "انہوں کی نظر میں" کے زیر عنوان پنڈت جی کے بارے میں ہندوستان کی اہم شخصیتوں کے تاثرات کو اور "غیروں کی نظر میں" کے زیر عنوان

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۱)

اردو گھر فنڈ

یکم ستمبر ۱۹۶۸ء سے ۱۵ر ستمبر ۱۹۶۸ء تک

نمبر شمار	نام و مقام	رقم چندہ	ذریعہ ترسیل	وصولی کیفیت
۱-	ڈاکٹر الیف۔ اے خاں کلیم شاہجہاں پوری	۵-۰۰	منی آرڈر	خود
۲-	قاری مراد خاں صاحب نوتن حیدر آباد	۲-۰۰	"	"
۳-	ذوالقدر خاں صاحب خاں و حافظی گورکھپوری ضلع بلیا	۵-۰۰	"	"
۴-	سید شہاب الدین صاحب دسنوی بمبئی	۱۰۱-۰۰	چیک	"
۵-	پرنسپل عبد الغفار شاہ صاحب سرینگر کاشمیر	۱۰-۰۰	منی آرڈر	"
۶-	ایم ایم گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول دوواسہ کاشمیر	۹۰-۰۰	"	معرفت پرنسپل صاحب عبد الغفار شاہ
۷-	انوار الحسن صاحب رانچی، ۹ (بہار)	۱۵-۰۰	"	خود
۸-	طاہر صدیقی صاحب علی گڑھ	۱-۰۰	نقد	معرفت ایم حبیب خاں صاحب انسپکٹر انجمن ترقی اردو ہند
۹-	نور الیقین صاحب لاری گورکھپور	۱-۰۰	"	
۱۰-	اصغر علی ٹھیکیدار صاحب علی گڑھ	۱-۰۰	"	
۱۱-	نظام الدین صاحب بڑیا "	۱-۰۰	"	
۱۲-	رحیم الدین صاحب ٹی ٹی پٹنہ "	۱-۰۰	"	
۱۳-	ماسٹر ریاست علی خاں صاحب علی گڑھ	۱-۰۰	"	
۱۴-	ماسٹر چودھری عبد الغفار خاں صاحب "	۱-۰۰	"	
۱۵-	ماسٹر مختار احمد خاں صاحب	۱-۰۰	"	
۱۶-	مس افضال جہاں "	۱-۰۰		
۱۷-	ماسٹر انوار احمد صدیقی صاحب "	۱-۰۰		
۱۸-	ماسٹر خلیل الرحمن صاحب "	۱-۰۰		
۱۹-	امام الدین ٹھیکیدار صاحب "	۵-۰۰		
۲۰-	ڈاکٹر حسین صاحب مفتوی ایم اے دانشگدہ امروہہ	۱-۰۰	منی آرڈر	خود
۲۱-	صغرا بیگم صاحبہ مارشلی سکندر آباد	۲۰۰-۰۰	نقد	معرفت ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب
۲۲-	ڈاکٹر ہاشم علی صاحب اسپیشلسٹ حیدر آباد	۱۰۰-۰۰	"	
۲۳-	جناب ایس۔ ایم کاظم لکڑی کا پل حیدر آباد	۱۰۰-۰۰	"	
۲۴-	جناب محمد فضل الرحمن پرو وائس چانسلر علی گڑھ	۵۰۰-۰۰	چیک	خود
۲۵-	سلطان احمد صدیقی صاحب آجین	۵-۰۰	منی آرڈر	"
۲۶-	ایس۔ ایچ۔ اے قاضی صاحب ہیڈ ماسٹر مادری بیسک اسکول (کلکتہ ۱۰)	۲-۰۰	"	"
۲۷-	بشیر احمد ڈار صاحب منجانب بکشن ایم۔ ایم گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول دوواسہ کاشمیر	۲۲-۵۰		معرفت ضیاء ڈار درجہ دہم کلاس

میزان حال	۱،۲۴۹-۵۰
" سابق	۳،۲۸۳-۰۰
کل میزان	۴،۵۳۲-۵۰

مالک انجمن ترقی اردو ہند، پرنٹر و پبلشر سید ضیاء الدین علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا